نئی شاعری اور عہد حاضر کا المیہ

(فرد و سماج کے تناظر میں)

رضوانہ نقوی
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو

ڈاکٹر ساجد جاوید
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
یونیورسٹی آف سرگودھا

Abstract

Generally modern urdu poetry enumerates in "NEW POETR" but particularly in urdu poem's narration"NEW POETRY" meaning is that literary movement which emerged nearly 1958 and famed by the "LESANI TASHKEELAAT".This literary movement was not a bussinesslike incitement but a applied declaration of co concept poets and critics. Rejection and aberration was landmark of this movement which was superdded by scattered social and political native conditions.Mostly each literary reign discovers its own freshness and newness under its social, economical and political circumstances. After the dismemberment of 1947 topsyturvy conditions of native politics and international idealogical disorder created a congregational social tregady which gave the birth of a man who was interspersed ,jagged and was torn into pieces by iner and outer self. Till 1960 this social and human tregady touched to its peak of decline, this tregady and irregularity procreat the "NEW POETRY" .new petry's excelling preference was insurrection and infraction , which is illustrious in the poems of all new poets in diverse countenances. "THE NEW POETRY" made changes in the basic grid of urdu poem and made it more flexible so that the urdu poets could acclaim significance beyond to fettered of grammar and countenance. Noteable name of "NEW POETRY" who work to visualised the new poetry indivisualy are,Iftakhar Jalib,Jeelani

Kamran, Abbas Athar, Anees Nagi, Saleem ur Rehman,Zahid Darr,Tabassum Kashmiri , Abdul Rasheed and Saadat Saeed whose poems enlighted the features of new poetry. NEW POETRY'S movment was end up in 1980 as a movement. This poetry broke the boundries of traditional poetry and use the human and social facts as a intervention to say the agony and tregady of mankind.In this article it is tried to indicate the social and human tregady of present age which is ruining the destiny of mankind.

کسی بھی زبان کے ادب وشعر میں عصری شعور نوعِ انسانی کے مجموعی وقوف اور تجربے کا حاصل گردانا جاتا ہے۔نوعِ انسانی کا مجموعی وقوف وہ سماج ہے جو فرد کے تجربے کا میدان اور اس کی صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے کا ضامن ہے۔فرد اور سماج کسی بھی تہذیب کا قیمتی اثاثہ،عصر کا ناگزیر حصّہ اور اس کے متحرک کل کی سب سے بڑی علامت ہیں۔اردو زبان کے ادبی وشعری سرمائے میں فرد اور سماج کا ذکر دورِ قدیم سے عہدِ جدید تک برابر موجود رہا ہے۔ماضی میں فرد پر سماج اور جزو ہر کل کو برتری حاصل رہی ہے۔مگر جدید صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ہی زمانے کی حالت منقلب ہو کر ''فردیت'' کے جس تصور کو سامنے لائی اس کے تحت بشر اجتماعی تاریخ وتہذیب سے منہ موڑ کر ایک نئے احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ احساس جدید تہذیب کا پیدا کردہ ہے جس کا آغاز مغرب میں سائنسی علوم و انکشافات کے فروغ سے ہوتا ہے۔اس نئی فضا نے سب سے پہلے ماضی کے قدیم تصورات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تہذیب و تاریخ کے قدیم تصورات وعقائد پر وار ہوا اور مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔مختلف صنعتوں کے قیام سے معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور ان مختلف النوع تبدیلیوں کے سیلِ بلا میں بشر افراتفری اور انتشارِ مسلسل سے دوچار ہوا اور اس پر مستزاد یہ کہ دو عالمی جنگوں میں وجودِ انسانی کی بے وقعتی اور پامالی نے ماضی کے متعینہ نظام ہائے حیات واقدار کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکا۔ ہر شے سے اعتماد اٹھ گیا اور ہر حقیقت فسانہ بن کر رہ گئی۔رشتوں کی ڈوریں ٹوٹ گئیں،سماج جو ایک زندہ کل کی حیثیت رکھتا تھا اور بشر جو سماج کا ناگزیر حصہ تھا پتنگوں کی طرح بکھر کر رہ گیا۔اس نوع کی انسانی وسماجی صورتحال کے تناظر میں فلسفہء لِ وجودیت کا ظہور ہوا جس نے ابتر عالمی سماجی حالات کے تناظر میں اس سوچ کو پختہ کر دیا کہ وجودِ انسانی دنیا میں دکھوں کا منبع ہے۔ انسانی مسائل کا حل اور انسانی دکھوں کا درماں ممکن نہیں۔اس دنیا میں انسان کو کسی صورت دہشت،خوف اور تنہائی سے نبرد آزما رہنا ہی ہے۔ دکھ لازمہء لِ حیات ہیں اور دکھوں کے بوجھ تلے دبے انسان کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ وجودِ انسانی کی مجبوری ومقہوری سے کامل آگاہی کے باوجود وجودی فکر انسان کی بے معنی حیات میں ذاتی آزادی، ذاتی امنگ اور ذاتی اعتماد کا دیا فروزاں کر کے فرد کی حیات اور اس کے اردگرد بکھری کائنات میں اثباتِ ذات کے ذریعے جشنِ طرب بپا کرنے اور روشنی پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔اردو ادب میں وجودیت باقاعدہ تحریک کی بجائے اپنے

انفرادی رجحانات ورویوں کے باعث شناخت رکھتی ہے۔جس کا اظہار زمانہء قدیم سے عہدِ جدید تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔جدید اردو شاعری کے تناظر میں تقسیم ہند کی سماجی و بشری صورتحال نے جس نوع کے کرب، بکھراؤ، بداعتمادی و بے یقینی کو جنم دیا اس کا عکس کئی دہائیوں تک فرد اور سماج کے آئینے میں مختلف انداز سے بار بار ابھرتا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں جنم لینے والی''نئی شاعری کی تحریک'' نے لسانی تشکیلات کے تحت وجودیت ہی نہیں دیگر عالمی ادبی تحریکوں اور ملکی و عالمی، سماجی وسیاسی منظر نامے سے بھی اثر قبول کیا۔لسانی تشکیلات کے تحت سامنے آنے والی تخلیقات روایتی شعری سرمائے کی پیروی سے دور ہیں۔گو کہ شعری و تخلیقی انحراف کی مثالیں راشد، میراجی اور اس عہد کے دیگر شعرا کے ہاں بھی موجود ہیں مگر تخلیقی ہمہ جہتی کے لیے جس نوع کی بغاوت کا مظاہرہ لسانی تشکیلات کے تحت ہوا اس کی مثال ماضی میں موجود نہیں۔ان شعرا نے لسانی تشکیلات کے عمل میں جس فرد اور سماج کو اپنی شعری تخلیقات میں جگہ دی، بیشتر شعرا کے ہاں اس کا ماضی سے کوئی رشتہ موجود نہیں اور اگر ہے بھی تو بہت کمزور۔ ماضی قریب میں فرد و سماج اور سماجی اقدار کے حوالے سے ردّ و انحراف کی مثال راشد کے ہاں موجود ہے لیکن راشد ماضی سے بغاوت کے باوجود ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔راشد کی نظموں میں پیش کردہ فرد عہدِ جدید کا انسان ہونے کے اعلان کے باوجود بار بار مشرقِ وسطیٰ کے تابناک ماضی اور سماج کی طرف پلٹتا ہے۔اسی بنا پر ان کی نظموں کا سماجی منظر نامہ عہدِ جدید کی افراتفری، نفسانفسی، بوالہوسی، پژمردگی، بیچارگی اور بے بسی کے زندہ لمحوں کی تصویر ہونے کی بجائے محض تصویری جھلکی معلوم ہوتا ہے۔نیز ان کی زبان جدید عصری حسّیت کو بھی ماضی کے ان دلفریب دھندلکوں میں کھینچ لے جاتی ہے جو مسلمانوں کے تابناک، مدفون عہد سے جڑا ہے۔میراجی کے ہاں فرد و سماج ہندی دیومالا اور جنس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔جبکہ ترقی پسندوں کے ہاں یہ صورتحال مادیت پرستی اور سیاسی نعرے کی نظر ہو جاتی ہے۔ترقی پسندی اور جدیدیت کے اردگرد انفرادی شعری تخلیقات بھی فرد و سماج کے حوالے سے جدت کے نعرے کے باوجود ماضی کی بازیافت کی طرف مائل محسوس ہوتی ہیں۔اس تمام شعری منظر نامے کے ساتھ جب نئے شعرا کی تخلیقات پر نظر جاتی ہے تو ان کی تخلیقات میں معاصر فرد اور سماج کے حوالے سے صنعتی، میکانکی اور مشینی تہذیب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدہ عصری صورتحال کو اس طور نشان زد کیا گیا ہے کہ پوری جدید تہذیب ان نظموں میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے:۔

> ''قدیم بنجر سیاہ ذرّوں میں بٹ گیا ہے شہر کی خرابہ گزرگاہوں کے ساتھ ناچتے اجنبی دیاروں کی دھول قدیم معاونت کا عذاب، شکنوں کی گرد، بہتے ہوئے جہنم کی راکھ سینے پہ منتشر، سب شبیہیں ہیں انجام ریزہ، محال کی مشتبہ حرارت بدن دکھن تر مرے دھما کے تضاد راہوں میں گرتی بہتی ارادتیں، میرے پاؤں بالکل ہی اٹ گئے ہیں مرے ارادے کی سیڑھیوں پر نزار صدموں کے عہدِ تہوار آبلوں کی شکستگی ہے جو مسافت مزار دیوار ہو گئے ہیں۔بیکار کا مزا شور تند تائید کے لئے بے طلب شکستہ نصیب اعصاب پر ابھی سے محیط گردوں، زمانہ رگ رگ رواں دواں ہے۔سوالِ بے چارگی کا موقع

گزر گیا کچھ تو مل گیا مر مریں بغاوت اداس راہوں کے سرد چہرے پہ جم گئی ہے۔''(۱)

مندرجہ بالا نظم کا ٹکڑا عہدِ جدید کے سماج میں انسانی صورتحال کی کسمپرسی اور بے بسی کی زندہ تصویر ہے کہ جہاں بشر کے اردگرد بپا ہنگامہء لِہستی میں انسان کا وجود بے وقعت اور بے قیمت ہوکر معمولی ذرّات میں ڈھل گیا ہے۔ پیٹ کے ایندھن کو سرد کرنے کے لئے ٹھوکریں کھاتے انسان نما جانور اور سہانے دنوں کے خوابوں کے سہارے دیارِ غیر کی مشینوں کا ایندھن بنتے مجبور انسانوں کے کرب کی تجسیم نہایت خوبی سے کی گئی ہے۔ بقول احتشام علی:۔

'' افتخار کی نظمیں مروجہ لسانی سختیوں کی شدید قسم کی شکست و ریخت کے باوجود اس عصری شعور سے بھی برابر جڑت رکھتی ہیں۔ جس کے عقب میں صنعتی اور میکانکی تہذیب کے ہاتھوں اضمحلال کا شکار ہوتے فرد کا المیہ پوری شدت کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔''(۲)

لسانی تشکیلات کے نمائندہ شاعر افتخار جالب کی نظموں میں فرد و سماج کا زندہ منظر ان کی شاعرانہ دقیق نظری، بین الاقوامی ادب کے مطالعہ ان کی قوتِ متخیلہ کی وسعتوں اور عالمی منظر نامے پہ دوررس نگاہ کا پروردہ ہے۔ ان کی نظموں میں فرد یا ''میں'' کا روپ استعاراتی توسیع کا روپ ہے۔ فرد کی انفرادی کلیّت اجتماعی کلیّت سے منسلک ہے۔'' مآخذ'' کی نظموں میں انسانی رشتوں کی جو اسطور مرتب ہوتی ہے وہ فرد کی کلیّت اور پھر اس کلیّت کی اجتماعی کلیّت کی اسطور ہے۔ فرد یا انسان کی کلیت کی لسانی ترتیب وتشکیل شعری عمل کا اصل اصول ہے۔ افتخار جالب نے شاعری اور جدید فلسفے کی اس مشترکہ بنیاد پر اپنے شعری شعور کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جدلیاتی شعور کو سمیٹا ہے کیونکہ جدلیاتی شعور زندگی اور سماج کو منجمد نہیں جانتا۔ بقول ڈاکٹر سعادت سعید:۔

'' انہوں نے نہ صرف اظہار کی کائنات میں اپنا عہد پیدا کیا بلکہ اپنے معاصر کئی اور شعرا کو اپنے اپنے عہد کی تشکیل کا ادراک بھی عطا کیا۔''(۳)

افتخار جالب کی نظموں میں فرد کی انفرادی آزادی کی کلیّت ،قومی خودمختاری کے مسائل،فلسطین وکشمیر اور دیگر مظلوم اقوام کا احساسِ محرومی اور ان کی مظلومی، جاگیردارانہ سماج کی گھٹن اور سرمایہ دارانہ نظام کے استبداد، جدید تہذیبی معیارات، سامراجی نفسیات، سیاسی چالیں نوآبادیاتی مفلوک الحالی ومحکومی تمام کے تمام معاملات ایک ہی کلیّت کا حصّہ ہیں۔ افتخار جالب انہیں الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں۔ ان کی نظموں میں فرد وسماج کی زیست سے جڑے تمام تر مسائل ومعاملات جذبہء لِ بے اختیار کی صورت سامنے آتے ہیں اور سماج میں انسانی کشمکش کی اذیت ناک صورتحال کو مجسم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے الفاظ میں:۔

''افتخار جالب کی شاعری کا بنیادی کردار انسانی کشمکش کی اذیت ناک صورت حال سے دوچار آزادی کے انتخاب کا داعی ہے۔ افتخار جالب اور لسانی تشکیلات کا نظریہ ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔ لسانی تشکیلات تاریخ، زندگی اور سماج سے متعلق ہمارے ادب میں کلیتاً نیا نظریہ ہے۔ افتخار

جالب کے بقول مواد کا لسانی تشکیلات کی ہیئت میں تجزیہ کرنے سے رائج الوقت شعری معیارات سے نجات مل جاتی ہے۔ پرانے اور نئے کی واضح حد بندی ہو جاتی ہے۔''(۴)

یومِ مئی کا جلوس:

''محنتیں لٹتی ہیں،عصمت کی طرح لُٹتی، ہیں بازار کے بھاؤ کی خرابی میں حسیناؤں کی تقدیر بھی اُلٹی ہے سرِ عام اٹھاتے ہیں تمناؤں کی انمول حقیقت کا حساب ایسا نہیں،کوئی بتا بھی نہ سکے۔ لُوٹنے والے مزے کرتے رہیں،عزتیں برباد بھی ہوں، لفظ زباں پر نہ رہے لطف کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے: کہنے کو سب کہتے ہیں: یہ ٹھیک نہیں!قسمتیں لٹنی نہیں چاہئیں: یہ ٹھیک نہیں! کہنے کو سب کہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ٹھیک ہے! یہ ٹھیک نہیں، صاحبو؛ الزام نہیں، عین حقیقت ہے: یہ دن لوٹ کے، لکھ لوٹ کے ہیں آج نہیں یہ سالوں کا دستور ہے: جو صاحبِ قدرت ہے، اُسے میری ماں، بہن کی عصمت کو کُھلے بندوں، سرعام، بلا خوف وخطر لوٹنے کا حق ہی نہیں، عین شرافت ہے: جزاک اللہ پھر یہ کہتے ہو مزدور کا دن مل کے منائیں گے: جزاک اللہ''(۵)

کشمیر کے حوالے سے

''خودارادیت انسان کی حقیقت: گہے کابوس گہے خواب کا بہروپ بھرے، عہد کی روداد لیے چلتی ہے: دوزخ کی ہوا؛ خونیں شفق وادی و کہسار کا ملبوس چمک دار نگاہوں کی چکا چوند، دلہن روپ کسے حوصلہ برداشت کرے داخلِ ایقاں: رگ و پے میں سلگ اٹھتی شہادت نے خبر دی کہ مرا صحنِ جہنم تری روداد مری ایک ہی منحوس مسافت ہے، مرے گھر سے ترے کوچے تلک، جانتا ہوں جانتا ہوں زندہ اساطیر کا پُرشعبدہ تخییر: اماں چاہتا: مجروح: مری ذات کی تعبیر ہے ناسُفتہ وژولیدہ، پشیمان(۶)

مندرجہ بالا نظمیں اس انسانی آزادی کی خواہش سے عبارت ہیں جو بشر کو روایتی، میکانکی، جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ بیڑیوں سے مُکت دیکھنا چاہتی ہے۔ آزاد انسانی انتخاب جہاں غلامی کا تصور ناپید ہو اور انسان انفرادی سیاسی، طبقاتی، معاشی، روایتی، اور بین الاقوامی آزادی کی تمناؤں سے سرشار ہو۔ بنگال کی خونناب مہک، 'یداللہ فوق ایدھم'، 'یوم مئی کا جلوس'، وقنا عذاب النار'، کشمیر کے حوالے سے'، جان گھلاتے خواب'، 'خاک وخون کا مجاہدہ' جیسی نظموں میں کامل آزادی کی یہ تڑپ بہت نمایاں ہے۔ دراصل افتخار جالب نو آبادیاتی نظام سے سمجھوتا کرنے کے بجائے اسے بے نقاب کرتے ہیں اور عہدِ جدید کے ملکی و بین الاقوامی سماج میں بشر کی غیر انسانی صورتحال کو انہوں نے لسانی تشکیلات کے ذریعے تمام تر بے معنویت، پیچیدگی اور غلاظت کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے۔''مختلف

سامراجی طاقتوں کے توسیع پسندانہ عزائم، یک قطبی دنیا کا قیام، نیو ورلڈ آرڈر کے تحت اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر مغربی اقوام کا ترقی پذیر مما لک میں بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، صارفی کلچر کے ذریعے مشرقی اقدار کی پامالی، عالمی صارفی معاشرے کے قیام کے بعد مختلف زبانوں کو لاحق خطرات اور بڑی طاقتوں کے مخصوص ایجنڈوں کے تحت تہذیبی و ثقافتی منابعوں کی زوال پذیری کے بیانیے ان کی نظموں میں پوری طرح جذب ہو کر سامنے آتے ہیں۔

''اے خوشا بخت کہ امریکہ نے
آدابِ سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا
ویت نام اک نئے دور میں داخل ہوگا
صنعت و حرفت و کلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے تو بس اتنی
الفاظ کی ناداری ہے!

☆☆☆

شیر بکری نے نئے گھاٹ کے دوارے، آرے
ورلڈ آرڈر کے بہیمانہ طلسمات نے ڈیرے ڈارے
ہم تہی دست تو پہلے ہی سے تھے، دیکھیے، مشروم فشن
شیرو شکر ہوتی زبانوں کا بطن ، قربت و لاچاری کا لنگوا کچرا
ٹاکسک ویسٹ میں تبدیل کیے دیتی ہے: تاحدِ نگاہ زیست کا کوڑ املبہ۔۔۔ہیروشیما کے دمِ عیسیٰ کا
ہر لحظہ نیا کن فیکون؟ ''(۷)

ورلڈ آرڈر کے راج تلے پنپتی زر پرست اقوام جنھوں نے اپنی عزتِ نفس اور خود مختاری قرضوں اور ڈالروں کے عوض فروخت کر دی ہوان کے سامنے مندرجہ ذیل نظم مثالِ آئینہ آویزاں ہے:۔

''انھوں نے اعضائے مردمی کاٹ کر عداوت خوشی سے کتوں کے آگے ڈالے
سنو، اگر بخش دو تو ہر دم غلام! منظور ہے؟
نہیں تو جتنا خراج چاہو، ادا کریں گے! قبول کرتے ہو؟
آؤ ممکن جو ہو سکے تو مصافحہ کر لیں، ٹھیک ہے؟''(۸)

مشینی و صنعتی تہذیبی غلبے میں، جہاں عالمی صارفی معاشرے میں ثقافتی و تہذیبی اجتماعت کسی عفریت کی طرح فرد کی انفرادیت و شناخت کو ملیا میٹ کر رہی ہے۔ اپنے ہی لوگوں کی نفرت، حکومتِ غیر کے جبر اور شعوری مراعات کی کٹھالی میں پگھلتا، نفسیاتی جبر سہتا ہوا وجود محرومی و اکتاہٹ کے اندھیروں میں کھو جاتا ہے۔

'انیس ناگی' کے ہاں فرد اور سماج ایک ایسے کلچر کے تناظر میں ابھرتے ہیں کہ جہاں انفرادی و اجتماعی ذمہ داری کا تصور مٹ چکا ہے۔ معاشرہ اقداری انحطاط، احساسِ کمتری، عدم تحفظ اور عملی رجعت پسندی کا شکار ہے۔ تیسری دنیا کے نیم ترقی پذیر معاشروں میں کہ جو بین الاقوامی محتاجی اور اقتصادی محرومی سے باہر نکل ہی نہیں پائے لوگوں میں عدمِ انصاف اور اس کے نتیجے میں محرومی و اکتاہٹ کا احساس وجود کا ناگزیر عمل بن کر ابھرتا ہے اور لوگ معاشرتی احساسِ یگانگت تو دور، کسی خاص مقصد یا تصورِ حیات کے بنا محض جبلی سطح پر زندگی گزارے چلے جاتے ہیں:۔

"میں جنوبی ایشیا کے ایک سے مرطوب کاغذ کی طرح جلتے سلگتے آرزوؤں سے تہی پس ماندگی میں
غرق شہروں میں جہالت اور ضلالت سے نمو پاتی زندگی کی دوڑ سے اکتا گیا ہوں" (۹)

"کس کو خبر کہ ہم سب ادنیٰ حقیر کیڑے تعمیر کے قرینوں میں مدتوں سے شامل اِک دن یونہی ہوا
کے پھیلے خلا میں آکر دم توڑنے سے پہلے بے مائیگی کے ماتم میں الوداع کہیں گے" (۱۰)

انیس ناگی کے ہاں جدید معاشرے میں فرد کا احساس بے مائیگی، تنہائی و اجنبیت کی ان کیفیات کا آئینہ ہے جو عہدِ جدید کی مخصوص حسّیت کا زائیدہ ہے۔ ان کیفیات کا ردّ عمل اس باطنی خلا کی صورت نمودار ہوتا ہے جو فرد کو گرد و پیش سے بیگانہ کر کے خود میں سمٹنے پر مجبور کر دیتا ہے:۔

"کہ میں خود آگہی کے بھاری سانسوں کا سمندر ہوں جسے نمکین پانی کی سزا آبادیوں سے دور رکھتی
ہے۔" (۱۱)

یہ نمکین پانی زندگی کی حقیقی لطافتوں اور الفتوں سے تہی ذات بھی ہے اور بشر کے کرب کی علامت بھی جو جدید معاشرے میں ہر باضمیر اور احساس انسان کا مقدر ہے۔ انیس ناگی کے کلیات میں 'نوحہ' کے عنوان کے تحت پیش کردہ نظمیں عہدِ جدید کے اسی انسان کا نوحہ ہیں جو اپنی فطرت کو فراموش کر کے زر کے تعاقب میں اتنا دور نکل گیا ہے کہ اب اپنی اصلیت و حقیقت تک واپسی ناممکن ہو گئی ہے۔ یہاں جدید سماج کے بوالہوس انسان کے متعدد روپ ابھرتے اور غائب ہوتے ہیں کہ جو انسانیت کے نام پر دھبہ بن کر رہ گیا ہے۔ جس کے لیے زیست محض لمحوں کا بہلاوا اور نفسا نفسی کی دوڑ میں سب کو پچھاڑ دینے کا نام ہے۔ اور نتیجہ ایک مسلسل اذیت، بیزاری، بے دلی اور گھٹن ہے۔

"چمنیوں سے نکلتا دھواں بالٹی میں ٹپکتا ہوا گرم پانی زمین پر گرا سرخ صابن کلون کی مہک سے فضا
رنگ رنگ اوہ! وہی ناشتہ ایک بیزار سی خانگی زندگی ایک منحوس سی دفتری زندگی خواب آنکھوں میں
کوئی نہیں منظروں کے دیئے بجھ چکے بدن کی مہک بھی نہیں زندگی ایک تلوار کی دھار ہے جس پہ
میرے قدم رات کے پیرہن کا سہارا لیے اور کبھی دن کی رسی کو تھامے ہوئے چل رہے
ہیں۔" (۱۲)

"سلیم الرّحمٰن" کے ہاں فرد کا وجود اک ایسے معاشرے میں ابھرتا ہے جس کی بنیادیں کھوکھلی اقدار پر قائم

ہیں۔اورآج کا حقیقت پرست فرد ان اقدار واثاثوں،عقائد وتصورات کو اپنی ذات سے دور پھینک دینا چاہتا ہے کہ جو اپنی حقیقت،اپنا اثبات نہ کرواسکیں۔چنانچہ سلیم الرّحمٰن کے ہاں ابھرنے والا فرد داخلی وخارجی خلفشار کے درمیان لڑکھڑاتا وہ باغی ہے جس نے احترامِ آدمیت کی کھوکھلی روایات اور مابعد الطبیاتی سہاروں سے خود کو آزاد کروا کے زندگی میں بے یقینی،تضاد اور مہملیت کا راستہ اختیار کیا ہے۔

بقول محمود شام

''سلیم الرّحمٰن نے سارتر کی طرح اس زندگی کی مہملیت کو محسوس کیا ہے۔سارتر کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں نہ تو نیکی ہے نہ کوئی قدر اور نہ ہی دنیا کا کوئی مقصد ہے یہ میری ہے اور مہمل ہے۔''(۱۳)

ماضی کی تہذیبی واقداری روایت کے ردّ کے بعد سلیم الرّحمٰن کی نظموں کا فرد حال کے جن لمحوں کا مکین ہے وہ انسانی حیات کے لیے سراسر اذیت،کرب اور آزمائش سے عبارت ہیں۔ماضی کی پناہ گاہ سے دوری اور حال کی اذیتوں سے دوچار ہونے کے بعد شاعر یا فرد کے لیے ایسی کوئی شمع امید فروزاں نہیں ہے کہ جس میں وہ خوش آئند مستقبل کے خواب جھلملاتے دیکھے چنانچہ جدید سماج کا فرد صنعتی و مشینی تہذیب کے آگے اپنی حیات کو بے معنی تصور کرتے ہوئے اس بات کا برملا اظہار کرتا ہے کہ:۔

''میرے اور موت کے درمیان سانس کا ایک لمحہ ہے اور عمر کا ایک جھونکا مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے۔''(۱۴)

سلیم الرّحمٰن کی نظمیں جدید صنعتی سماج میں حصولِ تعیّشات کی غرض سے اپنی زندگی کو گروی رکھنے والے ایسے انسانوں کا قصّہ بھی بیان کرتی ہیں جو تلاشِ زر میں بے وطنی کا عذاب سہتا خاک ہو جاتا ہے۔کم مائیگی ذلت، دھتکار اور تنہائی کی کرچیاں اس کی شخصیت کو اس قدر مسخ کر دیتی ہیں کہ خود اپنی شناخت بھی محال ہو جاتی ہے۔بقول جیلانی کامران:۔

''شام کی دہلیز'' جبر اور تقدیر کی مرتب کی ہوئی دستاویز ہے۔جس میں انسان مجبور ومحکوم ہے،اشیا اس کے اختیار سے باہر ہیں اور وہ صرف ایک بے جان مزدور کی طرح زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔''(۱۵)

''میں نے دیکھا ہے اسے اور لی اور بیتھر و پر ہاتھ میں تھامے ہوئے کاغذ کے پرزے ورک پر مٹ،اجنبی گمنام لوگوں کے پتے مفلسی کا بوجھ غم کے سوٹ کیس''(۱۶)

چنانچہ عہدِ جدید کا یہ بے بس انسان زندگی میں کسی بشارت اور خوش کُن امید سے دور اپنی عزتِ نفس کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں گروی رکھ کے سسکتے سسکتے اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔اور اس سے منسلکہ رشتے مادی آسائشات کے بوجھ تلے ہنسے مسکراتے اس مانوس اجنبی کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جو ان کی بقا کا ایندھن بنا۔

''شام کی خاموشی ہی سبق ہے میرے لیے بگڑی ہوئی تقسیم ہوں کیا کیا ملکوں اور زبانوں کی

راستوں اور وعدوں کی اور زمانوں کی رات اور دن کی سرحد میرے بیچ سے ہو کر گزری ہے کٹا ہوا
اپنا سر ہاتھوں میں تھامے تھکے تھکے قدموں سے رات کے زینے پر چڑھتا ہوں میں اپنی جدائی کا
قصّہ دہرانے کو میرے خون کی بیلیں نیچے سیڑھی سیڑھی پھیلی ہیں۔''(۱۷)

''تبسم کاشمیری'' کی نظموں میں لسانی تشکیلات کا عمل جس فرد اور سماج کو پیش کرتا ہے وہ عہدِ جدید کا ہی عکس ہے۔ان کے ہاں معاشرہ مادی ضروریات کے اس کارخانے کی صورت سامنے آتا ہے جہاں لحاتی لذتوں کی خاطر رشتوں کو بے دریغ خام مال کی صورت استعمال کیا جاتا ہے۔ایسے میں سماج کا فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد شوکیس میں رکھی ایسی چیز بھی بن جاتا ہے کہ جسے مطلوبہ قیمت ادا کر کے خریدا جا سکتا ہے۔تبسم کاشیری کے ہاں فرد و سماج کا قصّہ آپ بیتی کی صورت بھی عیاں ہوتا ہے اور جگ بیتی کی صورت بھی۔عصرِ جدید کے اس سماج میں کہ جہاں اخلاقی اقدار و روایات،حرمت،ضمیر،ظرف،احساسِ عظمت و توقیر وہ پرانی اور از کارِ رفتہ اشیا بن گئی ہیں کہ جنہیں ہوسِ زر کے کرم نے کھوکھلا کر ڈالا ہے تبسم کاشمیری مٹتے ہوئے انسان کا نوحہ کہتے گریاں کناں بھی نظر آتے ہیں اور طنز کی چبھن سے سوئے ہوئے احساسِ آدمیت کو جگانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔تبسم کاشمیری کی لسانی تشکیلات میں سماجی فرد کے مقابل شاعر کی ذات فعال بھی ہے اور بیدار بھی۔وہ اپنے سماج اور اس کی صورتحال سے بیزار اور دکھی تو ہیں مگر خود احتسابی کے عمل سے اس صورتحال کو بدلنے کی سعی میں بھی پیہم مصروف ہیں۔انیس ناگی کے بقول:۔

''وہ کسی قبل از وجود اخلاقی ضابطے کو قبول کرنے کی بجائے اپنے ارد گرد میں موجزن زندگی اور نظاموں پر کاٹتی ہوئی نگاہ ڈالتا ہے،وہ انسانی تظلّم،معاشرتی ناہمواری اور انسانی منافقت کو انسان کا سب سے بڑا دشمن گردانتے ہوئے احتجاج کی صورت میں اپنے ردّعمل کو منظّم کرتا ہے۔چنانچہ ان کی نظموں میں ایک خصوصی معاشرتی سیاق و سباق میں زندگی کو بسر کرنے کا چلن ملتا ہے۔یہ تبسم کاشمیری کی اخلاقی دیانت ہے کہ وہ معاشرتی ناانصافی کے ماحول میں رہتے ہوئے اس میں شرکت کرنے پر مجبور ہے۔اس احساس کے نتیجے کے طور پر اس کی نظموں میں احساسِ جرم کی کیفیت بڑی شدت سے ملتی ہے۔ بلکہ اسکی بیشتر نظمیں اسی احساس کی پیداوار ہیں، وہ اپنے معاشرے کے اجتماعی جرم کو سارتر کے کردار فرانز کی طرح قبول کرتا ہے:''(۱۸)

''یہ کیسا زہر ہے جو پھیلتا جاتا ہے معدے میں یہ کاری زہر ہے جو رات کے معدے سے ٹپکا ہے
تشدد،خوف،دہشت،بربریت رات کے کالے ستم گر سیاہ ماتھے پر ندامت ہی ندامت''(۱۹)

تمثال کی تمام نظمیں اسی انسانی و سماجی صورتحال کی عکاس ہیں جہاں انسان کا وجود مختلف ٹکڑوں میں بٹا اجتماعی خود غرضی و بے گانگی،کے گرداب میں برسرِ عمل ہے۔جدید سماج کے کاروبارِ حیات میں منافقت سب سے بڑا قرینہ ہے جس نے انسان کی اصلیت چھین کر اسے تہی دست کر دیا ہے کہ یہی آج کے دور کا چلن ہے۔اور انسان چاہ کر بھی اس سے نجات نہیں پا سکتا نتیجتاً داخلی کرب و گھٹن اس کی سانس کا رستہ تنگ کر رہی ہے۔

''شام گزری تو لمحے لمحے کا اجنبی اپنے گھر کولوٹا لوگ نکڑ پہ کچھ کھڑے تھے''کون ہوتم'' وہ پوچھتے تھے''میں وہی ہوں جو صبح گزرا تھا اس گلی سے''نہیں نہیں تم وہ نہیں ہو، وہ اور کوئی تھا، دوپہر کو بھی تم نہیں تھے ۔۔۔۔۔۔میں ٹوٹتے اور بنتے لمحوں کے جبر میں ہوں میں کب سے بنتا ہوں ٹوٹتا ہوں بکھر رہا ہوں''مگر یہ کیوں ہے؟''وہ سوچتا ہے سوچ کالی لکیر بن کر بدن میں اس کے اُتر گئی ہے عقبی حملوں سے جنم زخمی ہے اپنا چہرہ اٹھا کے ہاتھوں میں رات بھر اب وہ چیختا ہے''(۲۰)

مجموعی طور پر تبسم کاشمیری کے ہاں فرد اور سماج کا عکس ایک پُرآشوب ماحول کے تناظر میں کرب کی لہر بن کرا بھرا ہے۔اس سماج کا فرد مغلوب اور دکھی ہے جس کے نالے میں عصرِ جدید کی پوری کہانی بھی موجزن ہے اور اس سماج میں بسنے والے انسان کی سوانح عمری بھی۔

''ہم اونچی چمنیوں میں شور کرتے کارخانوں میں دھوئیں سے پیٹ بھرتے ہیں ہمارے نامہء اعمال میں ہرگز نہیں بخشش فرشتے ہم سے نالاں ہیں ہمارے سرخ ماتھوں پہ گناہوں کی لکیریں ہیں۔''(۲۱)

''سعادت سعید'' کی لسانی تشکیلات میں فرد وسماج کا منظر نامہ عصرِ جدید کی بدہیئتی، بدوضعگی اور کراہت کو منعکس کرنے کے لیے ملمعّ سازی سے دور فرد کے شدید داخلی کرب کو کریہہ تمثالوں اور بدہیئت پیکروں کے ذریعے واضح کرتا ہے۔جدید زر پرست منافق سماج میں فرد کا قلبی، ذہنی وفکری انتشار زوال پذیر تہذیب کے ملبے پر اپنی بے بسی کے نوحے کہتا ہے اور وہ انسان کو ردّ آدم علیل صورت گردانتے ہیں جس کے لیے زندگی ذلتوں کی وہ راکھ ہے کہ جسے عبرت وتکریم کے ساتھ فنا کی بہتی نالیوں کے کیچڑ کے سپرد کر دیا گیا ہو۔''طمع کے چوہوں نے ریشہ ریشہ دکھتی آنتیں کاٹ ڈالیں میں باتھ روموں میں گیلی گیلی دھڑکتا کاغذ کبھی میں ذلت بھرا وہ کش ہو کہ جس کا امکاں بدن میں سرطان بھر گیا ہو مری رگوں میں وہ آگ اترے کہ سر سے پاؤں کے ناخنوں تک میں راکھ ہو کر فضا میں بکھروں تو زندگی رنگ غلیظ ہونٹوں سے ذرّہ ذرہ نحیف پپٹوں میں جا کے ٹھہرے۔'' (۲۲)

'حیات کیا ہے وہ فاسد مواد زخموں کا جسے لپیٹ کے روئی کے چند گالوں میں غلاظتوں کی چلمچی میں دھو کے ڈالا گیا''(۲۳)

عبدالرشید کی لسانی تشکیلات فرد وسماج کا جو منظر نامہ مرتب کرتی ہیں وہ بھی صنعتی و مشینی عہد کے زوال سے عبارت ہے۔ جہاں فرد اپنے ہونے کا عذاب بے حسی کی صورت میں جھیلتا ہے۔انہوں نے فرد وسماج کی حقیقی کہانی کہنے کی کوشش کی ہے۔جدید سماج میں فرد کی ذات تاش کا وہ بے وقعت وبیکار پتہ ہے جسے بے رحمی سے تقدیر کے جابر ہاتھوں نے سماج کے ڈھیر پہ یوں پھینک دیا ہے کہ اس میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔عبدالرشید کی لسانی

تشکیلات میں فرد مسلسل اپنی تلاش میں ہے۔مگر منزل کو پا نہیں سکا۔فرد کے اردگرد بکھرا سماج ایک زندان کی صورت ہے جو سانسوں پہ گھٹن کے پہرے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ایسے میں فرد زندگی کی مسرتوں، لطافتوں اور تسکین سے تہی اپنے لخت لخت وجود کو سمیٹنے میں ہمہ تن معروف ہے۔عبدالرشید کے ہاں سماج کی خونخواری کے مقابل شبیہِ انسانیت پُر ہول شکلوں میں ڈھلتی جا رہی ہے۔کفروالحاد کے عناصر فروغ پا رہے ہیں۔بشر تضادات کی زد میں ہے۔قیدِ روز و شب اس کا نصیب ہے۔اس کی عظمت کی کہانی قصہء ِ پارینہ ہوئی،خوابوں کے دریچے ویران اور خواہشوں کے جنگل میں بشر مسلسل بھٹک رہا ہے مگر نشان منزل ہویدا نہیں۔منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی پہچان اپنی شناخت لازم ہے مگر سماجی صورتحال کی ابتری الجھی ہوئی گتھیوں کو اور الجھاتی جا رہی ہے۔ایسے میں زندگی ٹکڑوں کی صورت بکھری ہے اور سچائیاں توڑ پھوڑ کی زد میں ہیں۔

عباس اطہر، زاہد ڈار، احمد ہمیش، اختر احسن، آفتاب اقبال شمیم اور دیگر شعرا کے ہاں فرد اور سماج کا منظر نامہ حقیقی انسانی صورتحال کا عکاس ہے۔ جہاں بشر مسلسل بے چینی، خوف، بے یقینی سہم ناکی، اور احساسِ مرگ میں مبتلا ہے۔ان کے ہاں سماج کا کوئی مثالی تصور نظر نہیں آتا جو سماجی آشوب اور زیست کی خوفناکیوں میں پرمسرت حیات کا وسیلہ بن سکے۔ یہ تمام تر صورتحال حیات سے بیزاری کا شاخسانہ نہیں بلکہ عہدِ جدید کی وہ حسّیت ہے جو معاصر عہد کی انسانی صورتحال کے بطن سے برآمد ہوتی ہے۔ نئے شعرا کے ہاں یہ سماجی حسّیت جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا تمام دنیا کو محیط ہے۔ بقول انیس ناگی ''بشریت کا یہ رزمیہ زماں ومکاں کی عارضی حدود کو قبول نہیں کرتا۔ یہ مختلف علاقوں میں طلوع وغروب ہوتا رہتا ہے۔ یہ مغرب کی باتیں نہیں مشرق میں ظہور پذیر حقیقتیں ہیں جو نئے فنکار کا الہام ہیں نئے شاعر کا شعور اگر ایک طرف سات سمندر پار کے تہذیبی منطقوں سے متاثر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی جغرافیائی حدود اسے ایک مخصوص ماحول میں شرکت پہ آمادہ کرتی ہیں۔اس کا جغرافیائی حدود اربع اور اس کی رنگت نئے شاعر کے لیے ذہنی محل کو سمجھنے کا ایک اعلامیہ ہے۔اس کا حدود اربعہ اس کے لیے ساری انسانی صورتحال سے ایک رابطہ ہے۔''۲۴ چنانچہ نئے شعرا کی نظموں میں جس سماج کی جھلک نظر آتی ہے وہ شعراء ِ کے اپنے حدود اربع سے ہی منسلک نہیں بلکہ اس کی شناختی سرحدوں سے پرے پوری انسانیت کا سماج ہے۔ان شعرا کی نظموں میں ابھرنے والے مسائل انسانیت کے مسائل ہیں۔ چنانچہ ان مسائل پہ ان کا ردّعمل پوری انسانیت کا ردّ عمل بن جاتا ہے۔

> ''یہ دن اٹل ہے وہ دیکھ آنکھیں پگھل کے لپکیں شعور چڑھتے ہوئے دنوں کا زمین پہ پھیلا تمام میں ہوں، تمام تم ہو کھڑا ہوں سینہ سپر کھڑا ہوں خلاف اپنے کہ جنگ جیتوں تمام وقتوں کے فیصلوں کی۔''(۲۵)

مجموعی طور پر سماجی صورتحال کے کرب کا یہ احساس لمحاتی نہیں بلکہ یہ المیہ شاعر کی ذات وتخلیقات کا لازمی حصّہ ہے۔لسانی تشکیلات کے عمل میں نئے شعرا کے ہاں فرد اور سماج کی صورتحال ماضی کے

برعکس ایک بھرپور اور کامیاب تصویر بن کے ابھری ہے۔جس میں جدید معاشرے میں فرد کے حوالے سے ہیئتی اجنبیت،بُعد،دشمنی،نفرت،لوٹ کھسوٹ،حق تلفی،اجتماعی جبر و بے حسی جیسی منفی اقدار کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔معاشرتی سدھار کے حوالے سے ان شعرا نے با آواز بلند ظلم و جبر کی قومی و بین الاقوامی قوتوں کے خلاف احتجاج ریکارڈ کروایا ہے۔۔۔لسانی تشکیلات کا یہ عمل قدیم معاشرتی اسباب و علل کے تناظر میں نئے عہد سے جنم لیتے واقعات و حادثات کی گوناگوں اشکال کی نمائندگی کرتا ہے اور نئے معروضی و جوہری تجربات کو مروجہ زبان کی شکست و ریخت اور نئے لسانی محاورے کے ذریعے متشکل کرتا ہے۔اس نوع کی نظموں میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود تنوع اور رنگارنگی کا احساس نمایاں ہے۔لسانی تشکیلات کے فریم میں جڑی یہ تصویریں نئے سماج میں نئے انسان کے الجھاؤں،ذات کی شناخت،سچائیوں کی کھوج اور نئے حالات سے فرد کی نبرد آزمائی اور جفاکشی کا مجسم قصہ ہیں۔جن کی انتشاری کیفیات کو مقید کرنے کے لیے نئے شعرا نے لسانی شکست و ریخت اور تغیر و تبدل کے عمل کو اپنا کر بے مہابہ عصری انتشار و ٹوٹ پھوٹ کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے'' کیونکہ نئے معروضی اور جوہری تجربات زبان کی شکست و ریخت کے بغیر معرضِ وجود میں آنے سے قاصر ہیں۔''(۲۶)

حوالہ جات:

۱۔ افتخار جالب''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر'' کراچی القادر پریس۲۰۰۱ء ؁ ،ص۱۶۵

۲۔ احتشام علی،''جدید اردو نظم میں عصری حسیّت''لاہور سانجھ،۲۰۱۵ء،ص۱۵۴

۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید،''نئی شاعری: ایک جدلیاتی محاکمہ'' مشمولہ''معیار۱۰'،اسلام آباد،شعبہ اردو،کلیہ زبان و ادب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،ص۱۵۴

۴۔ ایضاً،ص۱۵۵

۵۔ افتخار جالب''یہی ہے مرالحن''لاہور،ملٹی میڈیا افیئر ز،جون۲۰۰۴ء،۱۵

۶۔ ایضاً،ص۱۱

۷۔ ایضاً،ص۸۹۔۹۰

۸۔ ایضاً،ص۱۰۲

۹۔ انیس ناگی،''بے خوابی کی نظمیں،لاہور مکتبہ جمالیات،ص۴۱

۱۰۔ انیس ناگی،''بیگانگی کی نظمیں کلیاتِ شعر''،لاہور: جمالیات،۲۰۰۰ء،ص۶۵

۱۱۔ ایضاً،ص۵۱

۱۲۔ ایضاً،ص ۶۲۷
۱۳۔ محمود شام،''میری صورتحال''مشمولہ''نئی شاعری''افتخار جالب (مرتبہ) لاہور: نئی مطبوعات،ص۱۷۶
۱۴۔ سلیم الرّحمٰن''شام کی دہلیز''لاہور:لوگ،۱۹۹۳ء،ص۱۶
۱۵۔ جیلانی کامران''نئے لکھنے والوں سے میری ملاقات''مشمولہ''نئی شاعری'' ص۱۳۸
۱۶۔ سلیم الرّحمٰن''شام کی دہلیز''،ص۵۸
۱۷۔ سلیم الرّحمٰن،''نظمیں''،قوسین:لاہور۲۰۰۲ء،ص۸۴
۱۸۔ انیس ناگی،پیش لفظ''تمثال''ازتبسم کاشمیری،لاہور:ارسلان پبلی کیشنز،۱۹۷۵ء،ص۱۲
۱۹۔ تبسم کاشمیری،''تمثال''لاہور:ارسلان پبلی کیشنز۱۹۷۵ء،ص۳۹
۲۰۔ ایضاً،ص۳۷۔۳۸
۲۱۔ ایضاً،ص۱۳
۲۲۔ ڈاکٹر سعادت سعید،''کجلی بن''لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز۲۰۰۷ء،ص۷۶۔۷۷
۲۳۔ ایضاً،ص۶۳۔۶۴
۲۴۔ انیس ناگی،''نئی شاعری کا منصوبہ''مشمولہ نئی شاعری افتخار جالب (مرتبہ)،ص۵۰
۲۵۔ انیس ناگی''بیگانگی کی نظمیں''،ص۶۴
۲۶۔ ڈاکٹر سعادت سعید،''آزادی اور ذمہ داری کی شعریات''مشمولہ''کجلی بن''لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء،ص۱۵

مآخذ:

۱۔ احتشام علی،''جدید اردو نظم میں عصری حسیّت''لاہور سانجھ،۲۰۱۵ء
۲۔ افتخار جالب''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر''کراچی القادر پریس ۲۰۰۱ء
۳۔ افتخار جالب''یہی ہے مرا لحن'' لاہور،ملٹی میڈیا افیئرز،جون ۲۰۰۴ء،۱۵
۴۔ انیس ناگی،''بے خوابی کی نظمیں ،لاہور مکتبہ جمالیات،
۵۔ انیس ناگی،''نئی شاعری کا منصوبہ''،مشمولہ نئی شاعری افتخار جالب (مرتبہ)،
۶۔ انیس ناگی''بیگانگی کی نظمیں'' ،لاہور: جمالیات،۲۰۰۰ء
۷۔ انیس ناگی،پیش لفظ''تمثال'' ازتبسم کاشمیری،لاہور:ارسلان پبلی کیشنز،۱۹۷۵ء،
۸۔ ڈاکٹر سعادت سعید،''کجلی بن'' لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز۲۰۰۷ء
۹۔ سلیم الرّحمٰن''شام کی دہلیز'' لاہور:لوگ،۱۹۹۳ء